مختصر تذکرہ

تحریکِ ریشمی رومال کے قائدِ اعلیٰ اور اسیرِ مالٹا

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی

مقدمہ

حضرت مولانا قاری مفتی محمد مسعود عزیزی ندوی مدظلہ العالی

رئیس مرکز احیاء الفکر الاسلامی مظفرآباد سہارنپور یوپی

تالیف

مولانا حمید اللہ قاسمی کبیر نگری

معاون مدیر ماہنامہ "نقوشِ اسلام" مظفرآباد سہارنپور یوپی

ناشر

دارالبحوث والنشر

مرکز احیاء الفکر الاسلامی مظفرآباد، سہارنپور (یوپی)

مختصر تذکرہ

تحریکِ ریشمی رومال کے قائدِ اعلی اور اسیر مالٹا

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ

مقدمہ

حضرت مولانا قاری مفتی محمد مسعود عزیزی ندوی

رئیس مرکز احیاء الفکر الاسلامی مظفر آباد، سہارنپور (یوپی)

مولانا حمید اللہ قاسمی کبیر نگری

معاون مدیر ماہنامہ ''نقوش اسلام'' مظفر آباد، سہارنپور (یوپی)

ناشر

دار البحوث والنشر

مرکز احیاء الفکر الاسلامی، مظفر آباد، سہارنپور (یوپی)

سلسلہ مطبوعات مرکز احیاء الفکر الاسلامی..........................(۳۵)

نام کتاب: مختصر تذکرہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ

تالیف: مولانا حمید اللہ قاسمی کبیر نگری

صفحات: ۴۸/

تعداد: ۱۱۰۰

قیمت: ۲۰/روپے

سنہ اشاعت.................................. ۲۰۱۴ء مطابق ۱۴۳۵ھ

باہتمام: عبد الستار عزیزی

کمپوزنگ: عزیزی کمپیوٹر سینٹر مرکز احیاء الفکر الاسلامی

ناشر

دار البحوث والنشر

مرکز احیاء الفکر الاسلامی، مظفر آباد، سہارنپور (یوپی)

Mob. 9719831058, 9719639955
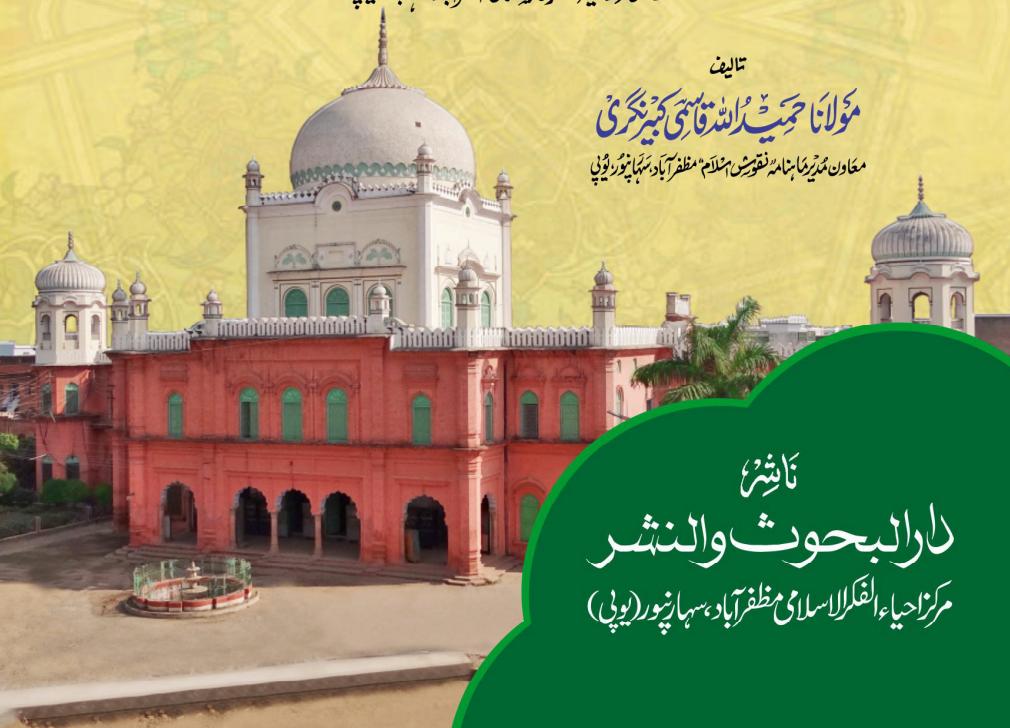
Email.masood_azizinadwi@yahoo.co.in

☆ دار الکتاب، دیوبند سہارنپور (یوپی) ☆ نعیمیہ بک ڈپو، دیوبند، سہارنپور

☆ مکتبہ ابو الحسن، محلّہ مفتی سہارنپور ☆ فیصل بک ڈپو، دیوبند، سہارنپور

☆ اتحاد بک ڈپو، دیوبند، سہارنپور ☆ مکتبہ ندویہ، دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

2

فہرست مضامین

مقدمہ

حضرت مولانا قاری مفتی محمد مسعود عزیزی ندوی

رئیس مرکز احیاء الفکر الاسلامی مظفر آباد، سہارنپور

الحمدللّٰہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی رسولہ محمد و آلہ وصحبہ اجمعین، امابعد!

بزرگوں کے حالات اور باکمال مصنّفین، محققین کے سوانح حیات اور مجاہدین فی سبیل اللہ اور علماء واتقیاء کی زندگی کے تابندہ نقوش آنے والی نسلوں کے لئے رہنما اصول اور زندگی گزارنے کیلئے بہترین شاہکار ہوا کرتے ہیں اور سبھی محققین وواقفین کو اس کا اعتراف ہے کہ قرآن وحدیث کے بعد انسانی زندگی میں سب سے زیادہ مؤثر بزرگوں اور کبار علماء دین کے حالات ہوا کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ہر زمانہ میں مصنّفین اپنے اپنے ذوق کے مطابق بزرگوں کے حالات پر خامہ فرسائی کرتے رہے ہیں۔

پیش نظر رسالہ ایک ایسے ہی باکمال مجاہد، عارف اور قائد حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے حالات پر ایک مختصر تحریر ہے، راقم کے نزدیک وہ شیخ الہند ہی نہیں بلکہ شیخ العرب والعجم اور شیخ العالم تھے، اس لئے شیخ الہند جیسی عظیم اور عبقری شخصیت کی عظمت وکمال، ان کا علم وفضل، ان کی خردمندی ودانائی، امت کے تئیں ان کی فکرمندی ودور اندیشی اور ان کی مجاہدوں سے بھرپور زندگی کا سراپا کھینچنا بہت اہم کام ہے، شیخ الہند ایک ایسی عہد ساز تاریخی اور ہمہ جہت شخصیت تھی جن کے رگ وپے میں انسانی ہمدردی وغمگساری اس درجہ تھی کہ غلام ملک میں ایک ایک برادر وطن کی آزادی کے لئے انہوں نے اپنی پوری زندگی کی راحتوں کو قربان کر دیا تھا اور ہندوستان کی سرزمین کو انگریزوں کے پنجۂ استبداد سے چھڑانے کیلئے

بہت سے جتن کئے تھے، یہاں تک کہ اس کیلئے مستقل ایک تحریک ''تحریک ریشمی رومال'' کے نام سے چلائی جس کی بنا پر قید وبند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں، اور اسیر مالٹا ہوئے اور غیر ملکی سوداگروں سے کوئی ساز باز نہیں کی، نہ ان کے لئے پیارے ملک کا تاج پسند کیا، بلکہ تادم آخر اپنے نظریئے وفکر پر قائم رہے اور آزادی ہند کا خواب دیکھتے رہے۔

یہ کتاب ''مختصر تذکرہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی'' ہمارے عزیز مولوی حمیداللہ قاسمی کبیرنگری سلمہ اللہ معاون ماہنامہ ''نقوش اسلام'' کی ایک عمدہ تالیف ہے، جو انہوں نے ایک مقالہ کی شکل میں تحریر کی تھی، راقم نے چاہا کہ اس کو کتابی شکل میں تیار کر کے شائع کیا جائے، تاکہ اس کا فائدہ عام ہو جائے، اس لئے موصوف نے اس میں ذیلی عناوین لگا کر اس کو دلچسپ اور خوبصورت بنانے کی کوشش کی، ان کی اس کوشش کو قارئین کے سامنے پیش کرتے ہوئے مجھے خوشی محسوس ہو رہی ہے، اللہ تعالی قبول فرمائے۔

اس کتاب میں عزیز مکرم نے مختلف عناوین کے ذریعے حضرت شیخ الہندؒ کے ان گوشوں کو اجاگر کیا ہے جن سے ان کی علمی اور فکری قربانیوں کے ساتھ ساتھ جہاد قومی وملی کی نشانیوں کا پتہ چلتا ہے اور حضرت شیخ الہند کے کارناموں اور ان کی زندگی کے اہم گوشوں پر اچھی روشنی پڑتی ہے، ایسے دور میں جبکہ امت کا ایک طبقہ اسلاف کے کارناموں سے ناواقف اور اپنے بڑوں کی قربانیوں سے بے خبر ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ نئی نسل کو اکابر اور اسلاف کے کارناموں سے روشناس کرایا جائے تاکہ وہ اپنی زندگی میں بزرگوں کی زندگی سے روشنی حاصل کرے۔

اللہ تعالی سے دعا ہے کہ اس رسالہ کو قبولیت عطا فرمائے اور عزیز موصوف کی صلاحیتوں میں روز افزوں اضافہ فرمائے اور خوب ترقی عطا فرمائے۔ وماذلك علی اللہ بعزیز

١٠ر شعبان المعظم ١٤٣٥ھ — محمد مسعود عزیزی ندوی

٩ر جون ٢٠١٤ء بروز پیر — رئیس مرکز احیاء الفکر الاسلامی مظفر آباد

تقریظ

حضرت مولانا نسیم اختر شاہ قیصر

حفید محترم خاتم المحدثین حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ

اسیر مالٹا حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کی عالی ہمت، بلند حوصلہ اور صاحبِ علم وفضل شخصیت کا تذکرہ دارالعلوم دیوبند کی ایک ایسی مثالی ہستی کا ذکر خیر ہے جس کے شب وروز اور زندگی کا ہر لمحہ ایک ایسے مردِ مجاہد اور عالم کا بیان ہے جن پر بہت کچھ لکھا گیا اور بہت کچھ لکھا جانا باقی ہے، ہمارے محترم مولانا حمید اللہ صاحب قاسمی کبیرنگری نے اپنے اس مقالہ میں حضرت شیخ الہندؒ کی زندگی کے ہر گوشے کو اس طرح سمیٹ لیا ہے کہ یہاں پر بھی ''دریا بکوزہ'' کا محاورہ صادق آتا ہے۔

مولانا حمید اللہ قاسمی کبیرنگری سنجیدہ اور متین قلم کار ہیں اور ان عنوانات پر دادِ تحسین دینے کے لائق ہیں جن کی ضرورت ہے اور جن پر لکھنا سعادتوں میں اضافہ کا موجب ہے، مولانا موصوف نے اس مختصر سے کتابچہ میں اس کی کوشش کی ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ کی زندگی کا پورا نقشہ بیک نظر سامنے آجائے، ولادت سے لے کر وفات تک تاریخ وار ان تمام واقعات اور احوال کو انہوں نے درج کر دیا ہے جس سے حضرت شیخ الہندؒ کی شخصیت کے ہر پہلو تک رسائی حاصل ہوتی ہے اور جن حضرات کو تفصیل کی ضرورت ہو وہ دیگر کتابوں کی طرف رجوع کر سکتے ہیں، حضرت شیخ الہند کی سوانح اور حیات پر کئی کتابیں بازار میں موجود ہیں جن میں تفصیل کے ساتھ تمام چیزیں آگئی ہیں۔

مولانا حمید اللہ صاحب قاسمی کبیرنگری کب سے لکھ رہے ہیں، یہ تو میرے علم میں نہیں لیکن ایک لمبے وقت سے میں انہیں رسالوں اور اخباروں میں پڑھ رہا ہوں اور اس کا معترف ہوں کہ اللہ تعالی نے زبان وبیان پر ان کو قدرت عطا کی ہے، تحریر کی نزاکتوں اور حلاوتوں سے وہ کما حقہ واقف ہیں، ماہنامہ ''نقوش اسلام'' میں مختلف موضوعات پر ان کے مقالات ومضامین پڑھنے کا خوب موقع ملتا ہے اور کافی کچھ حاصل ہوتا ہے، میں ان کی اس کاوش پر انہیں دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں، اس لیے جس جذبہ اور احساس کے ساتھ انہوں نے یہ مقالہ سپردِ قلم کیا ہے، وہی ایک مؤلف کا اصل سرمایہ اور اس کی محنتوں کا نچوڑ ہوتا ہے، خداوند قدوس اس کتابچہ کو مقبولیتِ عام وتام عطا فرمائے اور موصوف کے قلم کو نئی تب وتاب اور توانائیوں سے مستحکم فرمائے۔ (آمین)

والسلام

نسیم اختر شاہ قیصر

استاذ دارالعلوم وقف دیوبند

۵/مئی ۲۰۱۴ء بروز پیر

تقریظ

مولانا مفتی محمد ساجد قاسمی کھجناوری

مدیر ماہنامہ ''صدائے حق'' ومدرس جامعہ اشرف العلوم رشیدی گنگوہ

الحمد للّٰہ و کفی و سلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ امابعد!

برصغیر ہندوپاک میں ابھی ماضی قریب کی ڈیڑھ صدی میں دین ودانش، تہذیب وثقافت اوراحیاء مذہب وملت کے باب میں اسلام کے جن باتوفیق فرزانوں نے اپنے عزم وبسالت اورفہم وفراست کے چراغ روشن کرکے سرمایۂ دین وملت کومحفوظ رکھا، شیخ الہند حضرت مولانا محمودحسن دیوبندی علیہ الرحمہ (۱۲۶۸ھ/۱۸۵۱ء/ ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء) اسی سلسلۃ الذہب کی نمایاں کڑی تھے، اللہ بزرگ وبرتر نے انہیں جملہ اوصاف وکمالات کا جامع بنایا تھا، ان کے رگ وپے میں حمیت اسلامی کالہوگردش کرتا تھا، چنانچہ جس وقت آپ نے اس دنیائے آب وگل میں آنکھیں کھولی تو چاروں طرف اندھیرا تھا، اپنے ہی ملک پرسات سمندر پار کے غاصب انگریز قبضہ جمائے بیٹھے تھے، جنہیں یوں توہر ہندوستانی سے دلی نفرت تھی لیکن مسلمانان ہندکووہ اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل میں سب سے بڑی رکاوٹ اورسد سکندری سمجھتے تھے، اس لئے ان کا ٹارگیٹ بنیادی طور پر اولاً مذہبی مسلمان تھے، ان کا یہ اذعان فی الحقیقت درست بھی تھا کہ ایک مذہبی مسلمان ہی اپنے ملک وملت کا سچا وفادار ہوتا ہے اوراس کی یہ وفاداری نہ کسی دادودہش کے تابع ہوتی ہے اور نہ کسی عہدے ومنصب سے مشروط، لہٰذاان توحید مستوں اوراسلام پسندوں کاگلشن حیات اجاڑنا

اورانہیں دارورسن کے روح فرسا مراحل سے گذارنا ان فرنگیوں کا محبوب وظیفہ تھا، علماء اسلام ان کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتے تھے جوان کی استعماری سازشوں کاڈٹ کر مقابلہ کرنے میں کسی مصلحت یا ڈپلومیسی کے بالکل روادار نہ تھے، وہ آزادی ہند کے علم بردار اورتحفظ ملک وملت کےطرح دار تھے، چنانچہ حضرت شیخ الہند جوبچپن ہی سے ملک کے نشیب وفراز کا دردمندی کے ساتھ مطالعہ کررہے تھے آخرش بے چین ہواٹھے اوراپنی مادرعلمی دارالعلوم دیوبند کے مقصد تاسیس اورنصب العین کومدنظر رکھتے ہوئے میدان عمل میں کود پڑے، تحریک ریشمی رومال اوردیگر مختلف پلیٹ فارموں سے اپنی سرگرم جدوجہد کا بابرکت آغاز کیا، ملک کے وسیع تر مفاد کوپیش نظر رکھتے ہوئے برادران وطن کوبھی خوب جھنجھوڑا اورآزادیٔ وطن کی خاطر ان کے اندر سیاسی شعوروبصیرت پیدا کرنے کی سعی مشکور فرمائی، حضرت شیخ الہند کا ۱۹۰۵ء میں تیارکردہ وہ روڈ میپ خاصا مشہور ہے جس کا مقصد مسلح جدوجہد کی صورت میں ہندوستان سے انگریزوں کا حکومتی نظام تباہ وتاراج کرنا تھا، اس کے لئے آپ نے ملک وبیرون ملک میں پھیلے اپنے ہونہار شاگردوں اوررفقاء کوبھی اپنے مشن کا حصہ بنایا تھا جس کی تفصیلات کتب تاریخ میں مندرج ہیں۔

آمدم برسر مطلب یہ کہ حضرت کی ذات والاصفات ''درکفے جام شریعت درکفے سندان عشق'' کی بجا طور پر مصداق تھی، وہ اس دور میں خیرالقرون کا مثالی نمونہ تھے، قرآن وحدیث، فقہ وتفسیر کے جملہ علوم وفنون پر ان کی گہری نگاہ تھی، وہ اپنے اساتذۂ ذیشان کاحسین پرتو تو تھے ہی خودان کے شاگرد بھی علم وعمل کے آفتاب رشد وہدایت تھے کوئی شبہ نہیں کہ ایسی یگانہ روزگار شخصیات صدیوں بعد جنم لیتی ہیں جن کا وجود باجود صلاح وفلاح کا مصدر قرار پاتا ہے، اوربنی نوع انسان ان سے یکساں طور پر مستفید ہوتی ہے۔

مقام مسرت ہے کہ محبی فی اللہ مولانا حمیداللہ قاسمی کبیرنگری نے قلم وکتاب اورتحریک حریت کی علم بردار بافیض شخصیت حضرت شیخ الہندؒ کی یادوں، باتوں اوردل نواز حکایتوں

کو کتابی گلدستے کی شکل دے کر اپنے حسنات میں اضافہ کرلیا ہے، ایسے وقت میں جبکہ احسان فراموشی کا شکوہ عام ہے اور اسلاف بیزاری کی وبا نئی نسل کے لئے خطرات کے الارم بجا رہی ہے، تو اسلام کے ان جیالوں، توحید کے متوالوں اور جذبۂ جنوں کے دیوانوں کو یاد کرنے، ان کے مشن محمدی کو فروغ دینے اور ان کے مآثر وافکار کو عام کرنے کی ہر محمود کوشش لائق تبریک ہے، برادر مکرم مولانا حمید اللہ صاحب قاسمی کبیر نگری زید کرمکم مرکز احیاء الفکر الاسلامی مظفر آباد کے لائق فائق استاذ اور اس کے صحافتی ترجمان ماہنامہ ''نقوش اسلام'' کے معاون مدیر ہیں، گذشتہ کئی سالوں سے اپنے میر کارواں جناب مولانا مفتی محمد مسعود عزیزی ندوی حفظہ اللہ کے دست وبازو بن کر خدمت دین کی انجام دہی میں مصروف ہیں، لکھنے لکھانے کا بھی نفیس ذوق رکھتے ہیں، دار العلوم دیوبند کے فاضل اور اس کے فکری ورثہ کے امین ہیں، بندہ انہیں قلبی مبارکباد پیش کرتے ہوئے مستقبل میں ان سے مزید علمی وقلمی فتوحات کی توقع رکھتا ہے۔ (آمین)

وما ذالك على الله بعزيز

محمد ساجد قاسمی

مدیر تحریر ماہنامہ صدائے حق
ومدرس جامعہ اشرف العلوم رشیدی گنگوہ

۲؍رجب المرجب ۱۴۳۵ھ
مطابق ۲؍مئی ۲۰۱۴ء بروز جمعہ

عرض مؤلف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''شیخ الہند'' ایک عظیم اور نادرِ روزگار شخصیت کا نام ہے، ملت اسلامیہ ہند و پاک کی تاریخ میں بڑے بڑے علمائے دین، صوفیائے کرام، مشائخ عظام اور بڑے بڑے مصنّفین، مدبرین اور مفکّرین پیدا ہوئے جنہوں نے اپنے فضائل وکمالات کی عظمت کا سکہ لوگوں کے دلوں میں بٹھایا بلکہ اپنے کارناموں کی بدولت انسانوں کو ورطہ حیرت میں بھی ڈال دیا؛ لیکن آج تک کسی شخص کو ''شیخ الہند'' کا لقب نہیں ملا، اور واقعی حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ ایک ایسی ہمہ گیر اور ہمہ جہت شخصیت واقع ہوئی، جس نے اپنے علم وعمل، فضل وکمال، محاسن ومحامد، ایثار وقربانی، قوم وملت اور ملک ووطن کی خدمات جلیلہ پیش کر کے اپنا نام روشن کیا، یہ خطاب ان کے فضائل ومحاسن کی جامعیت، بزرگانہ شخصیت اور قائدانہ کردار پر اس طرح چسپاں ہوا کہ نام کا جز بن گیا اور آپ کی ذات ہندوستان ہی نہیں بلکہ پورے برصغیر کے لئے باعث صد افتخار ثابت ہوئی۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ نے اپنی زندگی کے ماہ وسال جس طرح گزارے اور جس جذبے کے ساتھ بسر کئے، اُس کا سلسلہ اسلامی تاریخ کے اس دور سے جا کر ملتا ہے جہاں سے نورانیت، پاکیزگی، حسن عمل، عزم وارادے کی روشنی پھلی ہوئی ہے، بلا شبہ شیخ الہند ان اساطین امت میں سے ایک تھے، جن پر صرف دار العلوم دیوبند ہی نہیں بلکہ پوری امت اسلامیہ فخر کرتی ہے، انہوں نے کردار وعمل، ایثار وجذبہ کے جو روشن نقوش ثبت کئے وہ آنے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ ہیں، شیخ الہند کی شخصیت مذہب

وسیاست میں سلطان وقت اور سکندر اعظم کی حیثیت رکھتی ہے، چونکہ ان کے یہاں انسانی ہمدردی وغمگساری کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے غلام ملک میں ایک ایک برادر وطن کی آزادی کے لئے اپنے آرام وراحتوں کو قربان کر دیا تھا۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ ہم بحیثیت مجموعی حضرت شیخ الہند کے بلند فکر وعمل اور ان کی عمدہ سیرت وکردار کو فراموش کر چکے ہیں، ان کی رات دن کی محنتوں اور کارناموں کو پس پشت ڈال دیا ہے، ان کی سرفروشانہ زندگی کا کچھ حصہ بیان کر کے ہم یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہم نے ان کے کارناموں کو مکمل طور پر بیان کر دیا، جبکہ ان کی دینی، قومی اور ملی قربانیوں کا ایک طویل سلسلہ ہے، ان کی قلبی جرأت اور عقل وشعور کی حکمت نے سیاست کے میدان میں بڑا ہی جرأت مندانہ اور انقلابی کردار ادا کیا، ملک کی آزادی کی خاطر انہوں نے کئی تحریکیں چلائیں جن میں ”تحریک ریشمی رومال“ ان کی زندگی کا ایک روشن باب ہے، انہوں نے اس تحریک کے ذریعہ انقلابی سرگرمیاں شروع کیں اور ایسا منظّم منصوبہ بنایا تھا کہ اگر یہ تحریک کامیابی سے ہمکنار ہو جاتی تو شاید پوری دنیا سے انگریزوں کا وجود مٹ جاتا، کیونکہ آپ کی اس تحریک کا دائرہ ہندوستان سے لیکر روس، جرمنی، ترکی، افغانستان اور بلاد عرب تک پھیلا ہوا تھا، مگر بدقسمتی سے اس تحریک کا راز فاش ہو گیا، جس کی پاداش میں آپ کو یورپ کے قید خانہ (مالٹا) میں ڈال دیا گیا۔

الغرض حضرت شیخ الہند جیسی عہد ساز تاریخی شخصیت کو تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی، چونکہ شیخ الہند صرف ایک انسان ہی نہیں تھے بلکہ آفتاب ساز اور مہتاب گر تھے، جن کے پاکیزہ افکار ونظریات اور مساعی جمیلہ کا زمانہ معترف ہے، ان کا علم وتقوی، اخلاق وسیرت مثالی تھی، قومی اور دینی خدمات میں، جامعیت وہمہ گیریت میں آپ کی ذات بے مثال تھی، آپ کے قائدانہ کردار سے ایک دنیا واقف ہے، ان کے کارنامے اور نقوش کو جس طرح بہت سوں نے قلم بند کیا ہے، اسی طرح راقم نے بھی مختصر سے کچھ نقوش ان کے

مرتب کئے ہیں، کیونکہ ان کی زندگی کے نقوش کا احاطہ کرنے کے لئے ایک دفتر درکار ہے، اس کتابچہ میں صرف ان کی زندگی کے چند نقوش ثبت کئے گئے ہیں، درحقیقت یہ انگلی کٹا کر شہیدوں کی صف میں داخل ہونا ہے۔

یہ کتابچہ دراصل راقم کا ایک مقالہ تھا، ہمارے مشفق اور کرم فرما حضرت مولانا قاری مفتی محمد مسعود صاحب عزیزی ندوی نے فرمایا کہ اس مقالہ کو کتابچہ کی شکل میں شائع کر دیا جائے تو اس کا فائدہ متعدی ہو جائے گا، مزید انہوں نے یہ بھی کہا کہ یہ دور بڑی مشغولیت کا ہے، چھوٹے رسائل اور کتابچوں کو عموماً خریدنا اور پڑھنا آسان ہوتا ہے اور ضخیم کتابوں کا پڑھنا مشکل ہوتا ہے، بہرحال ان کے مہمیز لگانے سے یہ کتابچہ شائع کیا جا رہا ہے، اللہ تعالی اس کتابچہ کو نفع بخش بنائے اور قبولیت عطا فرمائے، اخیر میں ان حضرات کا تہہ دل سے ممنون ومشکور ہوں جنہوں نے اس کتابچہ کو منظر عام پر لانے کیلئے راقم کی حوصلہ افزائی کی اور اپنے تأثرات لکھ کر راقم پر شفقت فرمائی، خصوصاً مولانا مفتی محمد مسعود عزیزی صاحب ندوی، مولانا نسیم اختر شاہ قیصر صاحب اور مولانا مفتی محمد ساجد صاحب قاسمی قابل ذکر ہیں، اللہ تعالی ان حضرات کو اپنی شایان شان اجر عظیم عطا فرمائے۔ (آمین)

والسلام

حمید اللہ قاسمی کبیر نگری
معاون مدیر ماہنامہ ”نقوش اسلام“ مظفرآباد

یکم رجب المرجب ۱۴۳۵ھ
یکم مئی ۲۰۱۴ء بروز جمعرات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مختصر تذکرہ

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ

تمہید

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی قدس سرہ ٗ کی مبارک ہستی نہ کسی تعارف کی محتاج ہے اور نہ کسی تاریخ کی دست نگر، ان کی حقیقی تاریخ ایک پیروں چلتی تاریخ ہے، جو ان کے تلامذہ اور مآثر علمی کی صورت میں ہمہ وقت دائر وسائر، نمایاں اور چشم دید رہتی ہے، اس امت مرحومہ میں لاکھوں علماء وفضلا پیدا ہوئے اور اپنے نورانی آثار دنیا کے لیے چھوڑ گئے، اور جن کی پامردی وشجاعت، جرأت ودانشمندی، عقل وتدبر اور انقلابی زندگی پر بہت سے لوگوں نے مختلف پہلوؤں پر بہت کچھ لکھا اور کہا ہے، کیونکہ اس مرد مجاہد، امام حریت نے اس صفحۂ ہستی پر ایک انقلاب آفریں اور نمایاں کارنامہ انجام دے کر تاریخ انسانیت کے اوراق کو اس طرح سجایا ہے کہ اس کا ایک ایک حرف آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کی شخصیت ایک انقلابی اور عبقری شخصیت تھی، جو ایک ہی وقت میں سپہ سالار بھی تھے اور رضا کار بھی، درویش حق پرست بھی تھے اور صوفی خدامست بھی، ایک طرف علم کے سیل رواں تھے تو دوسری روحانیت کے خاموش سمندر رتھے، اگر رات میں راہب تھے تو دن میں فارس تھے، اگر ایک جانب اسباب آسائش کے فقیر تھے، تو دوسری جانب دولت اخلاق نبویؐ کے امیر تھے، آپ کے متعلق قطب الاقطاب حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

''مولوی محمود حسن دیوبندی نسباً عثمانی شیخ زادہ ہیں، علوم دینیہ میں خصوصاً حدیث کے

اندر شہرۂ آفاق اور بخاریٔ وقت ہیں، کمالات علمیہ وعملیہ سے مالا مال اور دولت شریعت وطریقت کے بادشاہ ہیں، اپنی حالت کا اخفاء اور کتمان اس درجہ ہے کہ خواص کو پتہ لگنا دشوار ہے، جو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے خاص شاگرد ہیں، آپ کی بابرکت ذات سے کئی سو بلکہ کئی ہزار علماء محدثین بن چکے ہیں، ہندوستان میں اگر آپ کو استاذ الکل کا خطاب دیا جائے تو بجا ہے، کسر نفسی اور تواضع کا سبق آپ کے قدم قدم پر ہر حرکت وسکون سے حاصل ہوتا ہے، بایں وجہ بیعت لینے سے عموماً اپنے کو بچایا، مگر جوہر کو کتنا ہی گودڑ میں دبائے اور مشک کو کتنا ہی کپڑوں میں چھپائے، کھلے اور مہکے بغیر نہیں رہتا، آخر طالبین نے دامن کو پکڑا اور الحمد للہ ظاہری وباطنی نعمتوں سے مالا مال ہوئے''۔

الغرض حضرت شیخ الہند کی انقلابی زندگی ایک ہشت پہلو موتی کی طرح ہے، جس کی ہر جہت روشن وتابناک اور اہل کمال کی آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی تھی، جس وادی میں ان کے قدم پہنچے وہ گل گلزار ہوگئی، ان کا رخ جہل وضلالت کے جس ظلمت کدہ کی طرف ہوا، اس کو بقعۂ نور بنا دیا۔

ولادت باسعادت

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت ایسے وقت میں ہوئی جب مسلمانوں کے سات سو سالہ اقتدار کا سورج غروب ہو چکا تھا، ایسٹ انڈیا کمپنی(East India Company) کی مٹھی بھر فوج نے سارے ہندوستان میں زلزلہ برپا کر رکھا تھا، اسلامی مدارس سے ایمان ویقین کی ضیاپاشی مدہم پڑ چکی تھی، ٹھیک اسی وقت میں آپ کی ولادت مبارکہ بریلی میں ۱۲۶۸ء مطابق ۱۸۵۱ھ میں ہوئی، جہاں آپ کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علی صاحب (ابن شیخ فتح علی دیوبندی) بسلسلۂ سرکاری ملازمت قیام پذیر تھے، والد ماجد نے آپ کا نام محمود حسن رکھا مگر آپ کی خدمات اور قربانیوں کی وجہ سے آپ شیخ الہند کے نام سے مشہور ہوگئے۔

شیخ الہند الہامی لقب

حضرت علامہ مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہ کے قابل فخر شاگرد اور سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کے عظیم روحانی پیشوا حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب عثمانی قدس اللہ سرہ اس لقب کو الہامی لقب فرماتے تھے اور ایک جگہ یوں رقمطراز ہیں کہ: ''شیخ الہند'' کا لقب بارگاہ صمدیت میں یوں مقبول ومنظور ہوا کہ ملائکہ اللہ کی وساطت سے ہندوبیرون ہند کے لوگوں کے دلوں میں اس قسم کی خواہش پیدا فرمادی کہ پوری دنیا بیک زباں ہوکر آپ کو ''شیخ الہند'' کے لقب گرامی سے یاد کرنے میں ذہنی اور قلبی سکون محسوس کرنے لگی اور اصل نام اس ''الہامی لقب'' کے مقابلہ میں ثانوی حیثیت اختیار کرگیا''۔

ابتدائی تعلیم

ابتدائی تعلیم آپ نے بریلی میں ایک بزرگ میاں جی منگلوری سے حاصل کی اور ان ہی سے قرآن پاک پڑھا،اس وقت آپ کی عمر چھ سال کی تھی، پھر آپ نے اردو اور فارسی کی ابتدائی کتابیں شیخ عبداللطیف صاحب سے پڑھیں، اس کے بعد مولانا ذوالفقار علی صاحب کا تبادلہ (ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے ہی عہدے پر) بریلی سے میرٹھ ہوگیا، تو اس وقت حضرت شیخ الہند کی عمر سات سال کی تھی، یہیں ہندوستان کی تاریخ کا اہم ترین واقعہ غدر پیش آیا، ہندوستان والوں کے بغاوت کا کوہ آتش فشاں پھٹا اور اس کا لاوا چالیس میل دور دہلی شہر کی فصیلوں سے جاٹکرایا، دہلی اور اطراف دہلی میں قیامت صغریٰ برپا ہوگئی، لیکن میرٹھ میں یہ خاندان محفوظ رہا، حضرت شیخ الہند دیوبند بھیج دیئے گئے اور پھر مستقل یہیں رہے، مولانا ذوالفقار علی صاحب کے بڑے بھائی مولانا مہتاب علی صاحب کا گھریلو مدرسہ جاری تھا، شیخ الہند نے ان سے فارسی کے بعد عربی کتابیں پڑھیں، جب آپ کی عمر

پندرہ برس کی ہوئی تو قدوری اور شرح تہذیب وغیرہ پڑھ رہے تھے، اسی دوران دارالعلوم دیوبند کی بنیاد پڑی۔

دارالعلوم دیوبند میں بغرض تعلیم

حضرت شیخ الہندؒ نے جب تعلیم حاصل کرنے کے لیے دارالعلوم دیوبند کی چہار دیواری کے اندر قدم رکھا، تو اکابر دیوبند مسجد چھتہ میں جمع ہوئے اور ۱۵رمحرم ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء میں مدرسہ کا افتتاح کردیا گیا، اکابر کی موجودگی میں دارالعلوم کے پہلے مدرس ملا محمود کے سامنے جس طالب علم نے کتاب کھولی وہ یہی شیخ الہندؒ تھے، پھر مدرسہ نے تعلیم میں تیز رفتار ترقی کی اور طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہوا، تو مدرسین کی تعداد بھی بڑھائی گئی، اس لیے مولانا مملوک علی صاحب کے صاحبزادے حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی جو ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے منصب پر کام کررہے تھے، ان کو بلاکر مدرسہ میں صدر مدرس بنادیا گیا اور دہلی سے ماہر علوم ریاضی وحساب مولانا سید احمد دہلوی کی تقرری کی گئی، یہی حضرات شیخ الہندؒ کے استاذ تھے، شیخ الہند نے دارالعلوم کے قیام کے پہلے سال ۱۲۸۳ھ میں قدوری وغیرہ پڑھی، دوسرے سال ۱۲۸۴ھ میں کنز الدقائق فقہ میں اور فلسفہ میں میبذی، معانی، بدیع اور مختصر المعانی وغیرہ پڑھیں اور ان کتابوں کا آپ نے امتحان دیا، اور تیسرے سال ۱۲۸۵ھ میں جن کتابوں کا آپ نے امتحان دیا ان میں ہدایہ، مشکوۃ اور مقامات حریری کے نام آتے ہیں۔

حجۃ الاسلام حضرت نانوتوی کی خدمت میں

۱۲۸۶ہجری میں وسطیٰ کتابوں کے امتحان اور فراغت کے بعد صحاح ستہ کی تعلیم کے لیے آپ دارالعلوم کی چہار دیواری سے نکل کر میرٹھ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی

خدمت میں تشریف لے گئے، جہاں حضرت نانوتوی ایک مطبع میں ملازم تھے۔

شیخ الہندؒ ایک خالص علمی خاندان کے چشم وچراغ تھے، اس لیے فطری طور پر ان کا رجحان علمی کمالات کی جانب ہوا اور ان کو علمی استفادہ کے لیے وہ شخصیت ملی جو ایسی بے مثال تھی کہ صدیوں میں پیدا ہوتی ہے، وہ شخصیت حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی تھی، حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کے کمالات کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان کا علم کسبی نہیں بلکہ وہبی اور الہامی ہے، قدرت نے اسلامی علوم وفنون کی نشأۃ ثانیہ کے لیے خاص طور پر ان کو تیرہویں صدی میں پیدا کیا تھا، مولانا محمد قاسم نانوتوی علم وکمال کا دمکتا ہوا سورج تھے اور حضرت شیخ الہندؒ کا دل ایک آئینہ تھا، جب آئینہ سورج کے سامنے آیا تو سورج کی روشنی اور اس کی ساری آب وتاب اس میں جذب ہوکر رہ گئی، وہی آب وتاب اور چمک دمک جو سورج میں تھی بالکل وہی آئینہ میں آ گئی، تو جس طرح سورج پر آنکھ جمانا ناممکن تھا، اسی طرح آئینہ پر بھی نظر جمانا مشکل ہو گیا۔

حجۃ الاسلام کے والد گرامی کی خدمت کا شرف

شیخ الہندؒ کو اپنے استاد حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کے والد ماجد کی خدمت کا بھی شرف حاصل ہوا، وہ یوں ہوا کہ جب حضرت نانوتویؒ کے والد ماجد شیخ اسد علی صاحبؒ مرض وفات میں مبتلا ہوئے تو علاج کے لئے دیوبند لائے گئے، اور قیام حضرت شیخ الہند کے مکان پر تھا، ان کو دستوں کا مرض تھا، بعض اوقات دستوں کی کثرت سے کپڑے بھی آلودہ ہوجاتے اور انہیں دھونا پڑتا تھا، حضرت نانوتویؒ کے خداموں نے کپڑوں کا دھونا اپنے ذمہ لینا چاہا، مگر حضرت اجازت نہیں دیتے تھے اور فرماتے کہ یہ میرا حق ہے، اسے تلف مت کرو، چنانچہ خود کپڑے دھوتے تھے، اسی دوران ایک دفعہ ان کے والد صاحب کا دست چارپائی پر خطا ہو گیا، اس وقت نانوتوی بھی یہاں موجود نہ تھے، حضرت شیخ الہند

موجود تھے، اور صورت ایسی ہوگئی کہ نجاست اٹھانے کے لئے کوئی سامان بھی نہ تھا، تو حضرت شیخ الہند نے بے تکلف ساری نجاست اپنے ہاتھوں اور ہتھیلیوں میں لے لی اور سمیٹنی شروع کردی، تمام ہاتھ گندگی میں آلودہ ہی نہ تھے بلکہ ہاتھوں میں نجاست بھری ہوئی تھی، حضرت نانوتوی اتفاق سے پہنچ گئے اور دیکھا کہ محمود حسن کے دونوں ہاتھ نجاست اور مواد سے بھرپور ہیں اور وہ اسے سمیٹ سمیٹ کر باربار باہر جاتے ہیں اور پھینک پھینک کر آتے ہیں، اس پر حضرت نانوتوی بہت متأثر ہوئے اور وہیں کھڑے کھڑے ہاتھ دعا کے لئے اٹھائے اور عرض کیا کہ خداوندا محمود کے ہاتھوں کی لاج رکھ لے، اس خاص وقت میں جو جو دعائیں بھی اپنے اس محبوب تلمیذ کے لئے مانگ سکتے تھے وہ مانگی، بہرحال اس کا یہ اثر ہوا کہ وہی محمود حسن شیخ الہند اور عالمگیر زعیم بنے، جن کی فراست وجواں مردی اور جوش جہاد کے چرچے ہند وبیرون ہند میں ہوگئے۔

حجۃ الاسلام کی آپ سے محبت وشفقت

شیخ الہندؒ کو حضرت نانوتویؒ کی بڑی تربیت حاصل رہی، اپنے استاذ سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے اور خود حضرت نانوتویؒ بھی اپنے اس شاگرد کی بے پناہ ذہانت، کثرت مطالعہ اور درس کی تیاری کو دیکھ کر انتہائی شفقت ومحبت فرماتے تھے، اس کے بعد حضرت نانوتویؒ میرٹھ سے دہلی منتقل ہوگئے، تو شیخ الہند بھی انہیں کے ساتھ دہلی چلے گئے، وہاں پر بھی آپ نے اسباق کا سلسلہ جاری رکھا، حضرت نانوتویؒ سال میں باربار کبھی اپنے وطن نانوتہ اور کبھی دیوبند آتے جاتے تھے کبھی ہفتوں اور مہینوں قیام کرتے، تو شیخ الہند بھی انہیں کے ہمراہ کتابیں لیکر نانوتہ اور دیوبند آتے جاتے، نانوتہ اور دیوبند میں بھی اسباق کا سلسلہ جاری رہتا تھا، شیخ الہندؒ تقریباً دوسال مسلسل حضرت نانوتویؒ سے حدیث کا درس لیتے رہے، اور ۱۲۸۹ھ مطابق ۱۸۷۲ء میں تکمیل فرمائی، اسی دوران تعطیل کے دنوں میں

عربی ادب کی کتابیں اپنے والد ماجد مولانا ذوالفقار علی صاحب سے پڑھتے رہے، جن کا شمار اُس دور کے مشہور عربی ادیبوں میں ہوتا تھا۔

دستار فضیلت

۱۸۷۳ء میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ کے دست مبارک سے دستار فضیلت حاصل ہوئی، آپ نے حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ سے بہت کچھ حاصل کیا، دراصل زمانہ طالب علمی ہی سے آپ کا شمار ممتاز تلامذہ میں ہونے لگا تھا اور حضرت نانوتوی آپ سے خاص طور سے شفقت ومحبت رکھتے تھے۔

شیخ الہندؒ کے اساتذہ

حضرت شیخ الہند نے جن اساطین علم اساتذہ کرام کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا ان میں میاں جی منگلوری صاحب، میاں جی عبداللطیف صاحب، حضرت مولانا مہتاب علی صاحب، حضرت مولانا ملا محمود صاحب، حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتوی، حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہم اللہ جیسی زبردست علمی شخصیتیں ہیں۔

دارالعلوم میں بحیثیت معین مدرس

حضرت شیخ الہند نے جب فضیلت کی تکمیل کرلی تو آپ کی ذہنی وعلمی صلاحیتوں سے متأثر ہوکر اکابر علماء آپ کو کچھ اہم ذمہ داری دینا چاہتے تھے؛ لیکن آپ کے والد ماجد سے گفتگو کرنے سے پہلے ذمہ داری دینے سے باز رہے، بہر حال شیخ الہند نے اپنی تعلیم کے آخری دو سالوں میں خالی اوقات کے اندر تعلیم وتدریس کا سلسلہ شروع کردیا تھا، ان دو

سالوں میں جب آپ دیوبند میں رہتے تو طلبہ کی کئی جماعتوں کو بڑی بڑی کتابیں پڑھاتے رہتے تھے، چونکہ علمی استعداد بہت پختہ تھی، اس لیے طلبہ کا رجوع بھی آپ کی طرف تھا، آپ اعزازی طور پر طلبہ کو بڑی محنت سے پڑھاتے تھے۔

اعزازی طور پر تدریسی خدمت انجام دینا

۱۲۹۰ھ میں جس سال آپ کی دستار بندی ہوئی اس وقت بھی کئی جماعتیں آپ کے پاس پڑھ رہی تھیں، شیخ الہندؒ تو دوران طالب علمی اور فراغت کے بعد بھی اعزازی طور پر کار تدریس انجام دے رہے تھے اور تدریسی تربیت کے شعبہ میں داخل تھے، دارالعلوم میں طلبہ کا روز افزوں اضافہ ہوتا رہتا تھا، جب کہ اُس وقت صرف تین استاذ پڑھا رہے تھے، ایک تو ملا محمود دیوبندی، مولانا یعقوب نانوتوی اور مولانا سعید احمد صاحب دہلوی رحمہم اللہ، مگر یہ اساتذہ طلبہ کی اس بڑھتی تعداد سے تعلیم میں دشواریاں محسوس کرتے تھے، اس لیے انتظامیہ نے ایک اور مدرس کا اضافہ منظور کیا۔

دارالعلوم میں آپ کا تقرر

جب ارباب انتظام نے مزید ایک اور مدرس رکھنے کا فیصلہ کیا تو انتظامیہ کی نگاہ انتخاب حضرت شیخ الہند پر پڑی، جب انتظامیہ نے آپ سے کہا تو آپ نے فرمایا کہ میں اثبات یا نفی میں جواب دینے سے معذور ہوں، اس کا فیصلہ تو والد صاحب ہی کرسکتے ہیں کہ مجھے دارالعلوم میں کار تدریس انجام دینا ہے یا نہیں؟ آپ حضرات ان سے گفتگو فرمائیں، بہر حال انتظامیہ نے شیخ الہند کو دارالعلوم میں مدرس رکھے جانے کے سلسلے میں حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب سے گفتگو کی اور اپنے فیصلہ سے ان کو مطلع کیا اور منظور کرنے کی گزارش کی اور کہا کہ آپ اگر اجازت دیدیں تو ان کی تقرری کرلی جائے، مولانا ذوالفقار

علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ صاحبِ کمال علم وفضل کے ساتھ ساتھ بہت ہی خوشحال اور صاحب دولت وثروت تھے، وہ اپنے صاحبزادے کوایک دینی مدرسہ میں تنخواہ لے کر مدرسی کرنے کو کچھ زیادہ پسند نہیں کرتے تھے، اس لیے ابتداءً انہوں نے انکار کردیا، مگر جب دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا رفیع الدین صاحب نے اصرار کیا تو آپ نے ان کی مرضی پر چھوڑ دیا اور کہا کہ اگر آپ لوگ ضرورت سمجھتے ہیں تو رکھ لیجئے۔

شیخ الہندؒ بحیثیت استاد

چنانچہ ۱۲۹۱ھ میں شیخ الہند کو مدرس چہارم کی حیثیت سے دارالعلوم میں رکھ لیا گیا، آپ جب دارالعلوم میں درس دینے کے لیے حاضر ہوئے تو آپ کو قدوری، قطبی اور دیگر کتابیں عربی چہارم کی پڑھانے کے لیے دی گئیں، حالانکہ جب آپ اعزازی طور پر مدرس تھے، تو درجہ علیا کی کتابیں پڑھا چکے تھے؛ لیکن جب بحیثیت استاذ آپ کی دارالعلوم میں باقاعدہ تقرری ہوئی تو آپ کی تدریسی زندگی کا آغاز عربی چہارم کی کتابوں سے ہوا؛ لیکن ہر علم وفن میں کمال اور مہارت تامہ ہونے کی وجہ سے ہر سال آپ کو بڑے درجات کی کتابیں حوالے ہوتی رہیں، دوسرے سال عربی پنجم کی کتابیں زیر درس رہیں۔

شیخ الہند نے اپنی ذات کو دارالعلوم کیلئے وقف کردیا تھا

۱۲۹۳ھ میں آپ کے ذمہ نو اسباق تھے یعنی پورے اوقات میں ایک لمحہ کی بھی فرصت نہیں ملتی تھی اور کتابیں بھی وہ تھیں جن میں معرکۃ الآراء بحثیں ہوتی ہیں، آپ مشکوۃ شریف پڑھاتے اور سنن ترمذی بھی اور فقہ میں ہدایہ کا بھی درس دیتے تھے، میرزاہد اور ملا جلال بھی آپ کے زیر درس تھیں، حضرت شیخ الہند کی ذات گرامی تو دارالعلوم کے لیے وقف ہوکر رہ گئی تھی، نماز فجر کے بعد سے اسباق کا سلسلہ جاری فرماتے تو بارہ بجے تک

چلتا رہتا، پھر بعد نماز ظہر اسباق شروع ہوتے تو نماز عصر کے وقت ختم ہوتے، آپ شروع سے ہی ہر علم وفن کی کتابیں پڑھاتے تھے، حدیث، تفسیر، فقہ، اصول فقہ، منطق وفلسفہ اور معانی وبیان کی کتابیں آپ کے یہاں ہوتی تھیں، تدریسی زندگی کے اخیر دور میں آپ نے صرف صحاح ستہ کے اسباق اپنے ذمہ کر رکھے تھے۔

شیخ الہند کی صدر مدرسی اور طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد

شیخ الہند کی ان تیز تر علمی سرگرمیوں کی وجہ سے دارالعلوم میں علمی چہل پہل کے اندر بے پناہ اضافہ ہوگیا اور دارالعلوم کی شہرت دور دور تک پہنچ گئی، طلبہ کی تعداد آپ کے دور صدارت میں دوگنی اور چوگنی ہوگئی، آپ کے دور صدارت سے قبل دورۂ حدیث کے طلبہ کی تعداد کبھی پانچ اور کبھی چھ کم وبیش رہتی تھی، مگر آپ کے دور صدارت میں یہ تعداد بڑھ کر پچیس، چھبیس ہوگئی، پھر اس میں بتدریج اضافہ ہوتا چلا گیا اور طلبہ کی مجموعی تعداد بھی بڑھتی گئی اور ہندوستان کے ہر صوبے کے طلبہ دارالعلوم میں جمع ہوگئے، پھر آہستہ آہستہ اسلامی دنیا میں اس کے چرچے پھیل گئے، بلخ، بخارا، کابل، قندھار، سرحد، پشاور، بلوچستان، یاغستان اور قازان (روس) جیسے دور دراز علاقوں کے طلبہ دارالعلوم میں آنے لگے۔

شیخ الہند کے درس حدیث اور انداز درس میں وہ کشش تھی کہ برسہا برس تک حدیث کا درس دینے والے اساتذہ وشیوخِ حدیث ایک بار پھر طالب علم بن گئے اور شیخ الہندؒ کے حلقۂ درس میں زانوئے تلمذ طے کیا اور جن علمی جواہرات کی ان کو جستجو وتلاش تھی، وہ ان کو یہاں آکر مل گئی تو انھوں نے بیک زباں ہوکر فرمایا:

پھول جھڑتے ہیں دم گفتار تیرے نطق سے
علم کے سانچے میں ڈھل کر جب تو کرتا ہے کلام

شیخ الہندؒ کا انداز درس

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا انداز درس وہی تھا جو ان کے استاذ محترم حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا تھا، حضرت شیخ الہند کے شاگرد رشید اور ان کے جاں نثار خادم حضرت مولانا شاہ اصغر حسین میاں صاحبؒ نے اپنی کتاب میں شیخ الہندؒ کے انداز درس کی تفصیل اس انداز میں بیان کی ہے:

''مولانا موصوف تحریر فرماتے ہیں کہ '' آپ کے حلقۂ درس کو دیکھ کر سلف صالحین اور اکابر محدثین کے حلقۂ حدیث کا نقشہ نگاہوں میں پھر جاتا تھا، قرآن وحدیث حضرت والا کی زبان پر تھا، ائمہ اربعہ کے مذاہب از بر، صحابہ وتابعین، فقہاء ومجتہدین کے اقوال محفوظ، تقریر میں نہ گردن کی رگیں پھولتی تھیں اور نہ منہ میں کف آتا تھا، نہ مغلق الفاظ سے تقریر کو جامع الغموض اور بھدی بناتے تھے، نہایت سبک اور سہل الفاظ، بامحاورہ اردو میں اس روانی اور جوش سے تقریر فرماتے کہ معلوم ہوتا کہ دریا امڈ رہا ہے، یہ کچھ مبالغہ نہیں ہے، ہزاروں دیکھنے والے موجود ہیں کہ وہی منحنی اور منکسر المزاج، ایک مشت استخواں، ضعیف الجثہ، نحیف ونزار، لاغر وناتواں اور مرد خدا جو نماز کی صفوں میں ایک معمولی مسکین طالب علم معلوم ہوتا تھا؛ لیکن مسند درس پر تقریر کے وقت یوں معلوم ہوتا تھا کہ ایک شیر خدا ہے جو شان وشوکت کے ساتھ حق کا اعلان کر رہا ہے، آواز میں کرختگی آمیز بلندی نہ تھی؛ لیکن مدرسہ کے صدر دروازے تک بے تکلف قابل فہم آواز آتی تھی، لہجے میں تصنع اور بناوٹ کا نام نہ تھا؛ لیکن خدا تعالیٰ نے تقریر میں وہ اثر دیا تھا کہ بات دل نشیں ہو جاتی تھی اور سننے والا بھی یہ سمجھ کر اٹھتا تھا کہ حضرت جو کچھ فرما رہے ہیں، وہی حق ہے، حضرت مولانا کی زبان سے آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ کے معانی اور مضامین عالیہ سن کر بڑے بڑے زعماء سر نیاز خم کر کے معترف ہوتے کہ یہ علم کسی کو نہیں ہے اور ایسا محقق عالم دنیا میں کوئی

14

نہیں ہے، مسائل مختلف فیہا میں ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ بلکہ دیگر مجتہدین کے مذاہب بھی بیان فرماتے اور مختصر طور سے دلائل بھی نقل کرتے؛ لیکن جب امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا نمبر آتا تو مولانا کے قلب میں انشراح، چہرے پر بشاشت، تقریر میں روانی، لہجے میں جوش پیدا ہو جاتا تھا، دلیل پر دلیل، شاہد پر شاہد، قرینے پر قرینہ بیان کرتے چلے جاتے، تقریر رکتی ہی نہ تھی اور اس خوبی سے مذہب امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کو ترجیح دیتے تھے کہ سلیم الطبع اور منصف المزاج لوٹ جاتے تھے اور دور کی مختلف المضامین جن کی طرف کبھی خیال بھی نہ جاتا تھا پیش کر کے اس طرح مدعا ثابت فرماتے کہ بات دل میں اترتی چلی جاتی تھی''۔

بیعت اور سلوک ومعرفت

١٢٩٤ھ میں جب آپ اپنے استاد حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی معیت میں حج کے لئے حجاز مقدس تشریف لے گئے تو وہیں پر آپ نے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے بیعت ہونے کا شرف حاصل کیا، نیز حضرت حاجی صاحبؒ کے بیعت فرما لینے کے بعد حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے بھی آپ کو خلعت اجازت وخلافت سے نوازا، پھر ہندوستان تشریف لانے کے بعد اور حضرت نانوتویؒ کے انتقال کے بعد آپ نے اصلاح وتربیت کا تعلق حضرت گنگوہیؒ سے قائم فرمایا۔

شیخ الہند کی درس وتدریس سے کنارہ کشی

١٢٩٧ھ میں جب آپ کے استاذ مکرم اور شفیق محسن حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اس دنیا سے رخصت ہو گئے تو آپ کی ساری سرگرمیوں پر اوس سی پڑ گئی جیسے امنگوں اور حوصلوں کا روشن چراغ یک بیک بجھ گیا ہو اور چاروں سمت اندھیرا چھا گیا، کہاں وہ حضرت شیخ الہند جو روزآنہ اُنّیس اُنّیس کتابوں کا درس دیتے تھے، رات میں تصنیف وتالیف کا کام کرتے

اور دن میں اپنے استاذ کی خدمت میں حاضر ہو کر مشورہ وغیرہ لیتے تھے، آپ کی وفات پر دل افسردہ، روح پژمردہ، سینہ امنگوں، حوصلوں اور تمناؤں کا قبرستان بن گیا، فرط غم سے درس وتدریس کا سلسلہ ترک فرما دیا اور فرمایا کہ اب پڑھنے پڑھانے کا لطف نہیں، گھاس کھود کر زندگی بسر کرلیں گے اور یاد استاذ میں عمر گذار دیں گے: ع

جب دل ہی بجھ گیا ہو تو کیا لطف زندگی کا

لیکن حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی، شیخ التفسیر حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ، مولانا محمد رمضان منصور انصاریؒ ، مہاجر کامل حضرت مولانا رفیع الدین صاحب کے کہنے اور دوسرے اکابر کے سمجھانے پر راضی ہوئے اور پھر سلسلہ تعلیم جاری فرمایا۔

شیخ الہندؒ کے تلامذہ

آپ کے تلامذہ کی فہرست مرتب کرنا تو بہت مشکل ہے، چونکہ آپ کی ظاہری وباطنی علوم سے دارالعلوم دیوبند کا احاطہ چالیس سال تک جگمگاتا رہا اور اس عرصے میں ہزاروں علماء اس شیخ کامل کے حلقے سے آفتاب وماہتاب بن کر نکلے، اگر یہ مثل مشہور ہے کہ درخت اپنے پھلوں سے پہچانا جاتا ہے، تو بلاشبہ صحیح اور درست ہے؛ کیونکہ یگانۂ دہر، خاتم المحدثین حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ، ابوحنیفہ ہند حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ، شارح مسلم علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ، امام حریت حضرت مولانا عبید اللہ صاحب سندھیؒ، مفسر قرآن حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ، بانی تبلیغ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلویؒ، بانی مدرسہ شرعیہ مدینہ منورہ حضرت مولانا سید احمد صاحب مدنیؒ، شیخ الادب حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحب امروہویؒ، حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ، امام المنطق والفلسفہ حضرت علامہ مولانا محمد ابراہیم

صاحب بلیاویؒ، قائد قافلہ حریت مولانا منصور انصاریؒ، سید الملت حضرت مولانا محمد میاں صاحب دیوبندیؒ، حضرت مولانا سید فخر الدینؒ صاحب مرادآبادیؒ، حضرت مولانا رسول خاں صاحبؒ، حضرت مولانا عبد الصمد صاحب کرت پوریؒ، حضرت مولانا محمد صادق صاحب کراچویؒ، حضرت مولانا عزیز گل صاحبؒ، حضرت مولانا سید حامد حسن صاحب گنگوہیؒ، حضرت مولانا احمد اللہ صاحب پانی پتیؒ، حضرت مولانا محمد اکبر صاحب پشاوریؒ، حضرت مولانا محمد سہول صاحب بھاگلپوریؒ اور مادر زاد ولی حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب دیوبندیؒ جیسے سیکڑوں فضلاء واتقیاء آپ کے شاگرد ہیں، جن سے دنیا میں رشد وہدایت کی نہریں جاری ہیں، ہم جیسے ناقص الاستعداد حضرت شیخ الہند کی علمی خدمات کا بلند مقام ان شاگردوں ہی کے ذریعہ پہچان سکتے ہیں۔

امت پر آپ کا احسان عظیم

دوسری حیثیتوں سے قطع نظر صرف اپنی تدریسی زندگی کی وساطت سے حضرت شیخ الہند نے ایک دنیا کے لئے نفع رسانی کا جو سامان مہیا کیا، اگر اسی پر گفتگو کی جائے تو ایک دفتر درکار ہے، صحاح ستہ بالخصوص بخاری شریف اور ترمذی شریف کے درس کے دوران جس فراخ دلی سے آپ نے علمی جواہر پارے بکھیرے وہ کیا کم احسان ہے کہ پھر آپ نے ابواب بخاری اور بعض مشکل ترین فقہی مسائل پر معرکۃ الآراء رسائل لکھے جو ''بقامت کہتر بقیمت بہتر'' کی بین الاقوامی ضرب المثل کی واقعاتی تفسیر ہیں، دیگر بہت سے علمی ودینی، قومی وملی اور سیاسی احسانات کی طرح سب سے بڑھ کر آپ کا یہ احسان عظیم امت کی گردن پر رہے گا کہ آپ کے حلقہ درس سے وہ ''رجال علم'' سامنے آئے جن کے تحقیقی علم کے سامنے ایک دنیا سرنگوں ہے، اندازہ فرمائیں کہ ساقی کی نگاہ کرم کے صدقہ کیسے کیسے آفتاب وماہتاب آسمان علم وتحقیق پر جگمگا رہے ہیں۔

حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کی وفات کے بعد حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی عادت تھی کہ ہر جمعرات کو جب چھٹی کا گھنٹہ بجتا، تو درس دینا موقوف کردیتے اور گنگوہ جانے کے لئے تیار ہوجاتے، گنگوہ، دیوبند سے تقریباً ۴۵رکلومیٹر پر واقع ہے، حضرت اذان عصر پر چلتے اور عشاء گنگوہ پڑھ لیتے تھے، جمعہ کا پورا دن حضرت گنگوہی کی خدمت میں گزار کر عصر کی اذان کے قریب گنگوہ سے واپس ہوتے، اور عشاء دیوبند پڑھ لیتے تھے، برسہا برس یہی معمول رہا، سردی ہو یا گرمی یہ معمول کبھی قضا نہ ہوتا تھا، ہر ہفتہ ایک دن میں ۴۵رکلومیٹر کی مسافت کا طے کرنا جس غلبہ شوق ومحبت میں ہوتا تھا وہ اس سے ظاہر ہے کہ تکان نہ مانتے تھے، بہرحال شیخ الہند قطب الاقطاب کی خدمت میں حاضر ہوتے اور عام خدام کی طرح بیٹھ جاتے تھے۔

شیخ الہند کی تواضع

حضرت شیخ الہند کی تواضع وانکساری کے متعلق شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد رقمطراز ہیں: ''حضرت شیخ الہند اس بات کی تلاش میں رہتے تھے کہ کس بات میں نفس کشی ہوتی ہے اور تواضع وانکساری آتی ہے، اس کے لئے از حد کوشاں رہتے تھے اور جس چیز میں رعونت، جاہ طلبی، نفس پرستی، شہرت طلبی اور خود بڑائی ہوتی تھی اس سے کوسوں دور بھاگنے کی فکر کرتے تھے، پھر یہ نہ تھا کہ عام قاعدہ کے موافق زبانی اور ظاہری جمع خرچ ہو، بہت سوں کے حال یہ ہیں کہ اپنے آپ کو زبان سے کمترین، خلائق سگِ دنیا، ذرۂ بے مقدار، نابکار، ننگ خلائق وغیرہ لکھتے اور کہتے ہیں، مگر یہ سب کارروائی منافقانہ اور ریاکاری کی بنا پر ہوتی ہے، قلب میں اس کا ذرہ برابر بھی اثر نہیں ہوتا؛ بلکہ اس کے برعکس یہی خیال دل میں

جاگزیں ہوتا ہے کہ ''من دیگرے نیست'' اور اسی وجہ سے دوسروں کی عیب جوئی، ان کی نکتہ چینی، غیبت وغیرہ ہوتی رہتی ہے، اپنے معاصر کی بلکہ بسا اوقات اپنے سے پہلوں کی کوئی بھلائی سن لیتے ہیں تو بدن میں آگ لگ جاتی ہے، اور طرح طرح سے اس میں عیب نکالے جاتے ہیں اور یہ کوشش کی جاتی ہے کہ یہ شخص لوگوں کی نظروں سے گر جائے، اگر کوئی ہم کو جاہل، نالائق، احمق، گدھا اور کتا وغیرہ کہہ دیتا ہے تو آگ بگولہ ہوجاتے ہیں، اگر ہم اپنے آپ کو کمترین خلائق گردانتے ہیں تو گدھا اور کتا وغیرہ کہنے سے کیوں برا مان جاتے ہیں؟ آخر خلائق میں سے تو وہ بھی ہیں، الغرض حضرت شیخ الہند نے اپنے نفس کو ریاضتوں وغیرہ سے اس طرح مہذب بنالیا تھا کہ صادقین کے زمرہ شریفہ میں داخل ہوکر منصب عظیم حاصل کرلیا تھا، ان کی یہ فروتنی، کسر نفسی حالی تھی قالی نہ تھی، ان کا قلب اس بات کو دیکھتا تھا کہ جس کو ان کی زبان اور آنکھ ظاہر کررہی تھی وہ اپنے آپ کو واقع میں ایک معمولی مخلوق اور ایک ادنی درجہ کا انسان دیکھتے تھے، وہ ہر ایک کو اپنے سے بڑا اور افضل سمجھتے تھے، یہ عادت ان کی طبیعت بن گئی تھی جس میں ذرا بھی تکلیف نہ ہوتی تھی''۔

شیخ الہند کی عاجزی

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اپنے شاگرد حافظ محمد احمد صاحب کی بڑی قدر کرتے تھے، ساتھ ہی امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کے صاحبزادے کی بھی بڑی قدر کرتے تھے، جبکہ حضرت گنگوہی کے صاحبزادے آپ کے مریدوں میں سے تھے، مگر عاجزی کا یہ عالم تھا کہ ان دونوں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر معافی تلافی کرتے تھے، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی فرماتے ہیں کہ: ''حضرت شیخ الہند جب مالٹا سے تشریف لائے تو احقر ایک دن حضرت کی مردانہ نشست کے سامنے کے کمرے میں بند کواڑ کھول کر اچانک داخل ہوگیا، تو یہ منظر دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دونوں مخدوم زادے ابن

قاسم (حضرت حافظ محمد احمد صاحب) اور ابن رشید (حضرت حکیم مسعود احمد صاحب) تخت پر بیٹھے ہوئے ہیں اور حضرت شیخ الہند تخت سے نیچے ان دونوں حضرات کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں اور رو رہے ہیں اور ہاتھ جوڑے ہوئے انتہائی نیازمندی سے کہہ رہے ہیں کہ میں نے آپ دونوں کا کوئی حق واجب ادا نہیں کیا، اب میرے مرنے کا وقت ہے اور دونوں بزرگوں کو منہ دکھانا ہے، تو میں انہیں تم دونوں کے بارے میں کیا جواب دوں گا، تم دونوں کوئی کلمہ تسلی کا میرے لئے کہہ دو کہ میں وہی کلمہ ان بزرگوں کے سامنے کہہ دوں گا اور قیامت کے دن جب تم دونوں کے والد تم سے میرے متعلق کچھ پوچھیں تو تم بھی کلمہ خیر کہنا کہ یہ ناکارہ خادم ہمارا خادم ہی رہا اور ہم سے الگ نہیں ہوا''۔

شیخ الہند کی عاجزی کی انتہا

حضرت شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ اپنے استاد حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے صاحبزادے (حافظ محمد احمد صاحب) کے ساتھ خادمانہ برتاؤ فرماتے تھے، جبکہ حافظ محمد احمد صاحب شیخ الہند کے شاگرد تھے، حافظ محمد احمد صاحب جب شیخ الہند کے مکان پر تشریف لے جاتے تو جب حافظ صاحب دروازے کے سامنے کی سڑک سے آتے ہوئے نظر آتے تو حضرت شیخ الہند چارپائی چھوڑ کر کھڑے جاتے اور اس وقت تک کھڑے رہتے تھے جب تک حافظ صاحب مکان میں پہنچ کر اپنی جگہ بیٹھ نہ جاتے اور ان کے بیٹھنے کی صورت یہ ہوتی تھی کہ حضرت شیخ الہند کرسی منگواتے، اسے اپنے سرہانے بچھاتے، جب حافظ صاحب اس پر بیٹھ جاتے تب حضرت چارپائی پر بیٹھتے تھے، ایک جگہ حضرت شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ خود فرماتے ہیں کہ ''حافظ محمد احمد صاحب کا میرے دل میں اتنا احترام ہے کہ اگر وہ پاخانے کی ٹوکری اٹھانے کو بھی مجھ سے کہیں تو میں اس کی تعمیل کو اپنی عزت سمجھوں گا''۔

17

شیخ الہند کے معمولاتِ عبادت زمانۂ اسیری میں

شیخ الہند کی زندگی میں عبادت وریاضت کا یہ عالم تھا کہ فرائض تو فرائض ہی تھے نوافل، اوراد واذکار اور معمولات کی اس پابندی میں نہ درس وتدریس کی مشغولیت رکاوٹ بنتی تھی نہ ہی تحریکِ جہاد کی مصروفیت حتی کہ اسیری کے زمانہ میں بھی معمولات اپنی ترتیب کے مطابق انجام دیتے رہے، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی فرماتے ہیں کہ:

''مولانا عشاء کی نماز کے بعد بہت تھوڑی دیر جاگتے تھے کچھ اپنے اوراد پڑھتے تھے اور پھر پیشاب وغیرہ سے فارغ ہوکر وضو فرماتے، کبھی کبھی باتیں بھی کرتے تھے اور پھر سو جاتے تھے کیونکہ دس بجے کے بعد حکماً روشنیاں بجھادی جاتی تھیں، جہاں دس بجے اسی وقت سپاہی آواز دیتا تھا، سب چراغ اور موم بتیاں بجھانی پڑتی تھیں اور پھر تمام شب جلانے کی اجازت نہ تھی، جہاں جہاں کمروں میں برقی روشنیاں تھیں وہاں خود ہی بجھ جاتی تھی، البتہ پھر وہ برقی روشنیاں جو کیمپ اور راستوں کی روشنی کے لئے تھیں وہ تمام رات جلا کرتی تھیں، ان کا تار برقی کمروں کی روشنی کے تار سے علیحدہ تھا، الغرض دس بجے سے سب لوگ سو جاتے تھے، مولانا رحمتہ اللہ علیہ تقریباً ایک بجے یا ڈیڑھ بجے شب کو اٹھتے اور نہایت دبے دبے پیروں سے نکلتے، دروازے سے باہر تشریف لاتے، پیشاب سے فارغ ہوکر وضو فرماتے، گرمیوں میں تو گرم پانی کی ضرورت ہوتی ہی نہ تھی، نل کا پانی مناسب ہوتا تھا، سردی کے زمانے میں ہم نے یہ خاص اہتمام کر رکھا تھا کہ چولہے پر کھانے کے بعد ایک بہت بڑے ٹین کے لوٹے میں جو کہ چائے کے لئے گورنمنٹ کی طرف سے ملتا اور اس میں ٹونٹی پیچ دار لگی ہوئی تھی اور اس میں ہمارے معمولی دس بارہ لوٹے پانی آجاتا تھا، پانی خوب گرم کرلیا جاتا تھا اور پھر اسی پاس والے کمرے میں جہاں پر نل لگا ہوا تھا، اس لکڑی کے تخت پر جس پر سب کپڑے دھوتے تھے ایک کمبل میں لپیٹ کر عشا کے بعد رکھ دیتے

تھے، یہ پانی صبح تک گرم رہتا تھا، حالانکہ سردی بہت ہی زیادہ پڑتی تھی، اندھیرے ہی میں جا کر اس میں نماز تہجد ادا فرماتے تھے، جب اس سے فارغ ہو جاتے تو پھر چار پائی پر آ کر بیٹھ جاتے تھے، اور صبح تک مراقبہ اور ذکر خفی میں مشغول رہتے تھے اور ہزاروں دانوں کی تسبیح ہمیشہ سرہانے رکھی رہتی تھی، اسم ذات کی کوئی مقدار متعین کر رکھی تھی، اس کو ہمیشہ بالتزام پورا فرماتے، مراقبے کا اس قدر انہماک ہو گیا تھا کہ بعض اوقات میں دو دو، تین تین مرتبہ باتیں دہراتے مگر سمجھتے نہ تھے، صبح کی نماز سے پہلے اکثر استنجاء کرتے اور وضو کی تجدید فرما کر نماز باجماعت ادا فرما کر وہیں جانماز پر آفتاب کے بلند ہونے تک مراقب رہتے تھے، اس کے بعد اشراق کی نماز ادا فرما کر اپنے کمرے میں تشریف لاتے، اس وقت مولانا کے لئے ابلے ہوئے انڈے اور چائے تیار رہتی تھی، وہ پیش کر دی جاتی تھی، اس کو نوش فرما کر دلائل الخیرات اور قرآن شریف کی تلاوت فرماتے تھے، اس سے فارغ ہو کر کچھ ترجمہ قرآن شریف تحریر فرماتے یا اس پر نظر ثانی کرتے یا اگر خط لکھنے کا دن ہوتا تو خط تحریر فرماتے، اتنے میں کھانے کا وقت آ جاتا، کھانا تناول فرما کر چائے نوش فرماتے تھے، اس کے بعد اگر کسی سے ملنے کے لئے کسی کیمپ میں جانا ہوتا تو وہاں کا قصد فرماتے اور کپڑے پہن کر تیار ہو جاتے تھے، اور اگر جانے کا قصد نہ ہوتا تو آرام فرماتے اور اگر کوئی ملنے کیلئے دوسرے کیمپ میں سے آتا تو اس سے باتیں کرتے، اگر تیز گرمی کا زمانہ ہوتا تھا تب تو وہیں چار پائی پر اور اگر کچھ بھی سردی ہوتی تو صحن میں دھوپ میں قیلولہ فرماتے تھے، وہاں پر ہم سب دو تین گدے ڈال دیتے اور اس پر کمبل اور تکیہ بچھا دیتے تھے اور اگر کسی نے غفلت کی تو خود تکیہ لے جاتے اور ان گدوں اور کمبل کو بچھا کر آرام فرماتے، دو تین گدے ہم نے زائد اسی واسطے لے رکھے تھے جو کہ ہمیشہ علیحدہ رکھے رہتے تھے، اور جب تک وہ حاصل نہ ہوئے تھے تو بعض چار پائیوں کے گدے اٹھا لئے جاتے تھے، تقریباً دو ڈیڑھ گھنٹے تک اسی طرح آرام فرماتے تھے، پھر قضائے حاجت کے لئے تشریف لے جاتے اور پھر وضو

فرمانے کے بعد تلاوت قرآن شریف، دلائل الخیرات، حزب الاعظم وغیرہ میں مشغول ہوتے مگر قرآن شریف بہت زیادہ پڑھتے تھے، غالباً روزانہ دس بارہ پارے پڑھتے تھے، ظہر کی اذان تک اسی حالت میں رہتے تھے، پھر مسجد میں تشریف لاتے اور نماز سے فارغ ہو کر تھوڑی دیر ذکر واذکار میں مشغول رہتے، عصر کی نماز کے بعد اکثر مولانا رحمتہ اللہ علیہ ذکر خفی لسانی میں مشغول ہوتے تھے وہ ایک ہزار دانے والی تسبیح چادر یا رومال کے نیچے چھپا کر بیٹھ جاتے اور ذکر کرتے تھے، مغرب کے بعد بھی ذکر خفی میں مشغول ہو جاتے تھے“ یہ تھے شیخ الہند کے زمانہ اسیری کے معمولات عبادت جس سے ہم سبھوں کو سبق حاصل کرنا چاہئے۔

شیخ الہند کی تصنیفات

حضرت شیخ الہند کی تصنیفات کی فہرست زیادہ طویل تو نہیں ہے، کیونکہ آپ کے ابتدائی پچیس سال تو درس وتدریس میں صرف ہوئے اور اس کے بعد کی زندگی مجاہدانہ سرگرمیوں میں مصروف رہی، تاہم جس قدر تصانیف بھی آپ کی یادگار ہیں ان کو درج کیا جارہا ہے:

(۱) **ترجمہ قرآن کریم** : یہ آپ کا بہت بڑا علمی کارنامہ ہے جو اپنی افادیت اور عمومیت میں عالم گیر حیثیت کا حامل ہے، شیخ الہند خود قرآن کے مقدمہ میں اس کی وجہ تالیف بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں ”بعض احباب ومکرمین نے بندہ سے درخواست کی کہ قرآن کریم کا ترجمہ سلیس اور مطلب خیز اردو زبان میں مناسب حال اہل زمانہ کیا جائے، جس سے دیکھنے والوں کو فائدہ پہنچے“ آپ نے اس ترجمہ کا آغاز اس وقت فرمایا جب آپ دارالعلوم دیوبند کے مسند درس وتدریس پر جلوہ افروز تھے اور مالٹا کی جیل میں

یہ ترجمہ اختتام پذیر ہوا۔

(۲) **ادلہ کاملہ**: آپ کی اس تصنیف کی وجہ تالیف یہ ہے کہ مولانا محمد حسین بٹالوی نے مذہب حنفیہ پر اعتراض کرتے ہوئے ایک اشتہار شائع کیا تھا اور ہندوستان بھر کے حنفیوں کو چیلنج کر دیا تھا کہ رفع یدین، قرأت خلف الامام، آمین بالجہر، نفاذ قضا و قاضی وغیرہ جیسے مسائل کو اگر کوئی حنفی عالم قرآن وحدیث سے ثابت کر دے تو ہر مسئلہ کے عوض دس روپئے انعام پائے گا، آپ نے اس چیلنج کو قبول کیا اور نہایت مدلل جوابات تحریر فرمائے، ساتھ ہی گیارہ اعتراضات غیر مقلدوں کے مسلک پر قائم کردئے جن کا آج تک کوئی غیر مقلد جواب نہ دے سکا۔

(۳) **ایضاح الادلہ**: آپ کی اس تصنیف کی وجہ تالیف یہ ہے کہ غیر مقلدوں میں سے کسی نے ''ادلہ کاملہ'' کے رد میں ''مصباح الادلہ'' نام کی ایک کتاب لکھی، آپ نے ''ادلہ کاملہ'' کی وضاحت کرتے ہوئے ''مصباح الادلہ'' کا جواب دیا۔

(۴) **احسن القری**: یہ رسالہ ''ایضاح الادلہ'' کے چودہ سال بعد لکھا گیا، یہ رسالہ حضرت گنگوہی کے رسالہ ''اوثق العری'' کی وضاحت اور غیر مقلدوں کے علماء مولوی محمد سعید بنارسی اور مولوی محمد علی اعظمی کی تحقیقات کی رو میں لکھا گیا ہے۔

(۵) **جهد المقل**: آپ کی اس تصنیف کی وجہ تالیف یہ ہے کہ مولانا احمد حسن صاحب پنجابی نے امکان کذب کے مسئلہ میں حضرت شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ اور ان کے معتقدین علماء کرام پر سخت ترین اعتراضات کئے تھے، آپ نے ان اعتراضات کا نہایت محکم اور مسکت جواب تحریر فرمایا۔

(۶) **افادات**: یہ رسالہ آپ کے دو مضمونوں ''وحی اور اس کی عظمت'' اور ''لا ایمان لمن لا امانة له'' کا مجموعہ ہے۔

(۷) **الابواب والتراجم**: مالٹا کی جیل میں لکھی گئی بخاری شریف کی ابتدائی چند تراجم وابواب کی یہ مختصر شرح ہے۔

(۸) **کلیات شیخ الهند**: یہ کتاب آپ کے منظوم کلام کا مجموعہ ہے جس کو آپ کے شاگرد رشید حضرت مولانا سید اصغر حسین میاں صاحبؒ نے شائع فرمایا تھا۔

(۹) **تصحیح ابو داؤد**: آپ کو احادیث رسول سے ایک گونہ خاص شغف تھا اور آپ نے فن حدیث کی مختلف عنوانات سے خدمت بھی کی، چنانچہ ابوداؤد صحاح ستہ میں اہم کتاب ہے، آپ نے برسہا برس اس کا درس یا اور اثنائے درس آپ کو اختلاف عبارت میں خامیاں محسوس ہوئیں، آپ نے مختلف نسخوں سے عبارت کے اختلاف کو ختم فرما کر ابوداؤد کا ایک صحیح نسخہ ترتیب دیا۔

(۱۰) **حاشیہ مختصر المعانی**: آپ نے مختصر المعانی کا یہ حاشیہ مطبع مجتبائی کے مالک کی جانب سے بصد اصرار کے تحریر فرمایا تھا۔

ترجمۂ شیخ الہند پر حضرت رائے پوری کی نظر

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن شریف کا ترجمہ کر کے پوری مسلم امت پر احسان عظیم فرمایا ہے، یہ ترجمہ شاہ فہد پرنٹنگ پریس مدینہ منورہ سے کئی دفعہ چھپ چکا ہے، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ جب ترجمہ شیخ الہند لکھ رہے تھے تو جتنا لکھتے تھے اس کو رائے پور جا کر اپنے محبّ عالم (حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری) کو سناتے تھے

اورحضرت شیخ آنکھ بند کر کے شروع سے آخر تک سنتے تھے اور یہ طریقہ پندرہ پارہ تک رہا، اس کے بعد حضرت رائے پوری اس دنیا سے روپوش ہو گئے، تو حضرت شیخ الہند نے پندرہ پارے ان کی عدم موجودگی میں پورے فرمائے، جس کے سلسلہ میں کبھی کبھی حضرت شیخ الہند فرمایا کرتے تھے کہ پندرہ پارے جو میں نے حضرت کی خدمت میں سنائے ہیں، ان میں تو غلطی کا امکان ہے ہی نہیں، لیکن جو حضرت کی وفات کے بعد لکھے تھے اس میں غلطی کا امکان ہے۔

شیخ الہندؒ کی سیاسی خدمات

علمی اور معاشرتی سطح پر عظیم خدمات انجام دینے کے ساتھ حضرت شیخ الہند نے سیاسی سطح پر بھی اہم کارنامے انجام دیئے، سیاسی میدان میں اہم ذمہ داری نبھانے کے لیے ایسے دو واقعات نے آپ کو ابھارا:

ایک واقعہ پہلی جنگ عظیم کا تھا جو ۱۹۱۴ء میں ترکی سے سلطنت عثمانیہ کے خاتمہ کے لیے لڑی گئی تھی، اس زمانہ میں ترکی میں مسلمانوں کی خلافت تھی اور ترکی حکومت کا رقبہ انتہائی وسیع و عریض تھا، اسلام مخالف طاقتیں ترکی کے اثر و رسوخ کو توڑنے کے لیے سرگرم تھیں، اس واقعہ نے دنیا بھر کے تمام حساس مسلمانوں کو متأثر کیا، انہی میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے۔

دوسرا واقعہ ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط تھا، اگرچہ ہندوستان کو غلام بنائے ہوئے انگریزوں کو ایک صدی گزر چکی تھی، مگر جوں جوں وقت بڑھ رہا تھا، باشندگان ہند پر انگریزوں کے مظالم کا دائرہ وسیع تر ہوتا جا رہا تھا اور غلامی کا احساس ہر ہندوستانی کو پریشان کر رہا تھا، حضرت شیخ الہند بھی سچے محبّ وطن تھے، ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے، یہیں ان کی پرورش ہوئی تھی، اس لیے انگریزوں کی غلامی سے آزادی کا جذبہ برسوں سے

آپ کے سینہ میں بھی کروٹیں لے رہا تھا، بالآخر آپ نے انگریزوں کی غلامی سے ہندوستان کو آزاد کرانے کا پختہ ارادہ کر لیا۔

انگریزوں سے قرآن کا چیلنج

۱۸۵۷ء میں جب انگریزوں سے معرکہ آرائی ہو رہی تھی اور جب انگریز خود کو شکست خوردہ محسوس کرنے لگے، تو کسی نے مشورہ دیا کہ ہندوستان میں سب سے زیادہ بیدار مسلمان ہیں، لہٰذا فتح مندی کے لیے پہلے مسلمانوں کو ناپید کرنا ہوگا، لیکن مسلمانوں کے ناپید کرنے سے پہلے پہلے ان کی مقدس کتاب (قرآن) کو ختم کرنا ضروری ہوگا، الغرض انگریزوں نے قرآن کریم کے کئی ہزار نسخوں کو نذر آتش کر دیا، یہ منظر دیکھ کر شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ نے انگریزوں سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا کہ تم تو قرآن کے نسخوں کو خاکستر کر دو گے؛ لیکن ان بچوں کو کیا کرو گے جن کے رگ و ریشے میں قرآن کا ایک ایک حرف جا گزیں ہو چکا ہے، انگریزوں نے اس تحقیق کے لیے ایک بچہ کو بلایا اور قرآن سننا شروع کیا، جب اس نے مع حرکات و سکنات کے قرآن پڑھنا شروع کیا تو انگریز دنگ رہ گئے اور سبھوں نے اپنے دانتوں تلے انگلیاں دبالی۔

تحریک ریشمی رومال

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے استخلاص وطن کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا، اور ایک چھوٹے سے قصبہ ''دیوبند'' میں بیٹھ کر اس سلسلہ میں وہ کام کیا جس کی نظیر مشکل ہے، اسی کام کی ایک کڑی یہ تھی کہ آپ نے اپنے ایک انتہائی تربیت یافتہ شاگرد حضرت مولانا عبید اللہ سندھی کو تانے بانے بننے کے لئے کابل بھیجا، چنانچہ مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے کابل سے ایک خط ریشمی پارچہ پر لکھا جس کا مضمون غالبًا یہ تھا کہ حکومت موقتہ نے

افغانستان سے عہد نامہ کرلیا ہے، باقی حکومتوں کے پاس بھی سفارتیں بھیجی جارہی ہیں، اس سلسلہ میں حکومت ترکیہ سے بھی ربط وضبط پیدا کرنا منظور ہے، مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے ان تمام حالات کولکھ کرایک معتمد شخص نومسلم عبدالحق کے ہاتھ حضرت شیخ الہند کی تحریک کے ایک خاص رکن شیخ عبدالرحیم سندھیؒ کے پاس بھجوایا تاکہ وہ اسے خود یا کسی قابل اعتماد شخص کے ذریعہ حجاز میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کو پہنچادیں، لیکن وہ خط (رومال) شیخ عبدالرحیم تک پہنچنے کے بجائے عبدالحق کے مربی خان بہادر رب نواز خان کے ہاتھوں میں پہنچ گیا، اس نے اسے انگریز گورنر کی خدمت میں پیش کردیا، اس طرح حکومت کو حضرت شیخ الہندؒ، مولانا عبیداللہ سندھیؒ اور دوسرے کارکنوں کی تحریک کے کچھ راز معلوم ہوگئے، اس خط کا حکومت کے ہاتھ لگنا ہی تھا کہ ہندوستان بھر میں گرفتاریوں، قید وبند اور تحقیق وتفتیش کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا، اسی وقت سے شیخ عبدالرحیم کا تعاقب شروع ہوگیا، اور حضرت شیخ الہند کو مکہ معظّمہ میں گوناگوں حوادث سے گزرتے ہوئے بالآخر گرفتار ہونا پڑا، تاریخ میں یہ کوشش "تحریک ریشمی رومال" کے نام سے موسوم ہوئی۔

شیخ الہند کی گرفتاری کا سبب

حضرت شیخ الہندؒ کی گرفتاری کا سبب ریشمی رومال کی تحریک کا پردہ فاش ہونے کا تھا جس میں ایک منظّم جنگی پلان تھا جوانہوں نے ہندوستان سے برطانوی حکومت کوختم کرنے کیلئے بنایا تھا، یہ ایک ایسا منظّم پلان تھا جس کی شاخیں ہندوستان سے باہر تک پھیلی ہوئی تھیں، پلان یہ تھا کہ جرمنی، ترکی اور افغانستان سے مدد لے کر ہندوستان کی شمال مغربی سرحد پر آزاد قبائل کے ذریعہ سے انگریزوں کے خلاف جنگ چھیڑ دی جائے، اور اسی کے ساتھ ہندوستان میں عام بغاوت برپا کرادی جائے، اس وقت چونکہ برطانیہ کی ساری فوجی طاقت جرمنی اور ترکی کے مقابلے میں مصروف جنگ تھی، اس لیے بیرونی حملے

اور اندرونی بغاوت پر انگریزوں کیلئے قابو پانا مشکل ہوجائے گا اور انھیں ہندوستان چھوڑ دینے پر مجبور ہونا پڑے گا، لیکن قضاوقدر کا فیصلہ تھا کہ تحریک کا راز افشاں ہوگیا اور حضرت شیخ الہند کو گرفتار کرلیا گیا اور مالٹا بھیج دیا گیا۔

جان تو نکال سکتے ہومگر ایمان نہیں

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "جب ہم مالٹا جیل میں تھے، اس وقت حضرت شیخ الہند کوسزا دیجاتی تھی جس سے جسم پر زخم ہوجاتے تھے اور کئی مرتبہ ایسا ہوتا تھا کہ فرنگی انگارے بچھادیتے اور حضرت کواوپر لٹادیتے تھے، جیل کے حکام کہتے محمود! صرف اتنا کہہ دو کہ میں فرنگیوں کا مخالف نہیں ہوں، ہم آپ کو چھوڑ دیں گے، حضرت فرماتے، نہیں! نہیں! میں یہ الفاظ ہرگز نہیں کہہ سکتا، میں اللہ کے دفتر سے نام کٹوا کر تمہارے دفتر میں نام لکھوانا نہیں چاہتا، ایک دفعہ حضرت آئے تو ہم نے دیکھا کہ آپ کو اذیت ناک سزا دی گئی ہے، ہم حضرت کے ساتھ تین چار شاگرد تھے، ہم سبھوں نے مل کر عرض کیا، حضرت! کچھ مہربانی فرمائیں، کوئی حیلہ یا تدبیر، حضرت کے چہرے پر غصہ کے آثار ظاہر ہوئے، فرمانے لگے حسین احمد! تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟ کیا میں ان کی تکلیفوں سے شکست تسلیم کرلوں، یہ ممکن نہیں، کیونکہ......

میں روحانی بیٹا ہوں حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کا کہ جن کوامیہ بن خلف تپتے ہوئے ریت پر لیٹا کر مارتا تھا۔

میں روحانی بیٹا ہوں حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کا جن کو کفار پکڑ کر اتنا مارتے تھے کہ ان کے ہوش وحواس جاتے رہتے تھے۔

میں روحانی بیٹا ہوں حضرت خباب رضی اللہ عنہ کا جن کو گرم کوئلوں پر چت لٹایا جاتا تھا۔

میں روحانی بیٹا ہوں حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کا جن کو ابو جہل نے برچھی مار کر
ہلاک کر دیا تھا۔
میں روحانی بیٹا ہوں امام احمد بن حنبلؒ کا جن کو اتنے کوڑے مارے جاتے تھے
کہ اگر ایک کوڑا ہاتھی کو بھی مارا جاتا تو وہ بھی بلبلا اٹھتا۔
میں روحانی بیٹا ہوں حضرت مجدد الف ثانیؒ کا جن کو دو سال کے لیے گوالیار کے
قلعہ میں قید رکھا گیا تھا۔
میں روحانی بیٹا ہوں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا جن کے ہاتھوں کو کلائیوں کے
قریب سے توڑ کر بیکار کر دیا گیا تھا۔
حسین احمد! کیا میں ان فرنگیوں کے سامنے شکست تسلیم کر لوں، نہیں یہ ہرگز نہیں
ہوسکتا، میرے جسم سے جان تو نکال سکتے ہیں، مگر میرے دل سے ایمان نہیں نکال
سکتے، سبحان اللہ!۔

کاش میری موت میدان جہاد میں ہوتی

حضرت شیخ الہند مالٹا سے رہائی کے بعد کم وبیش پانچ ماہ حیات رہے اور اس مختصر عرصے
میں رائے پور، مراد آباد، امروہہ اور علی گڑھ کے اہم اسفار فرمائے، جن کا تعلق تحریک
آزادی یا تحریک خلافت وغیرہ کے ضروری پروگراموں سے تھا، ان مقامات پر ہونے
والے تحریکی جلسوں میں آپ بڑے جوش وجذبات کے ساتھ شریک ہوئے، اجلاس علی گڑھ
کے موقع پر آپ کی طبیعت ناساز تھی، ضعف اور کمزوری غالب تھی؛ لیکن اس اجلاس میں یہ
کہہ کر شرکت فرمائی کہ ''اگر میری صدارت سے انگریز کو تکلیف ہوگی تو میں اس میں ضرور
شریک ہوں گا'' علی گڑھ کے بعد دہلی تشریف آوری ہوئی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی کوٹھی
پر قیام فرمایا اور یہاں آپ کا بڑے اہتمام واحتیاط کے ساتھ ڈاکٹر انصاری نے علاج

ومعالجہ کیا، لیکن حیات مستعار کے دن جاچکے تھے، اس لیے علالت اور اس کے ساتھ
استغراقی کیفیت ہر روز بڑھتی چلی گئی، اسی حالت میں ایک مرتبہ بہت حسرت کے ساتھ فرمایا
''مرنے کا تو کچھ افسوس نہیں ہے؛ لیکن افسوس یہ ہے کہ بستر پر مر رہا ہوں، تمنا تو یہ تھی کہ میں
میدان جہاد میں ہوتا اور اعلائے کلمۃ اللہ کے جرم میں میرے ٹکڑے کیے جاتے''۔

مسلمانوں کی تباہی کے دو سبب

حضرت شیخ الہند نے ۱۳۳۷ھ میں مالٹا کی قید سے واپس آنے کے بعد دیوبند میں
علماء کے ایک بڑے مجمع کے سامنے ارشاد فرمایا: میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں
اس بات پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے
ہیں، تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے:

☆ ایک ان کا قرآن کا چھوڑنا۔

☆ دوسرے ان کے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی۔

اس لیے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی، اس کام میں صرف
کردوں کہ: ''قرآن کریم کو لفظاً ومعناً عام کیا جائے''۔
بچوں کیلئے لفظی تعلیم کے مکاتب ہر ہر بستی میں قائم کئے جائیں، بڑوں کو عوامی درس
قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کیلئے
آمادہ کیا جائے اور مسلمانوں کے باہمی جنگ وجدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔

شیخ الہند کی آنکھوں میں آنسو

حضرت شیخ الہند نے اپنی وفات سے پہلے اپنے شاگرد رشید حضرت مولانا سید حسین احمد
مدنی کو کسی اہم کام کے لئے کلکتہ جانے کا حکم فرمایا اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ یہ خدمت

میری خدمت سے زیادہ اہم اور بامقصد ہے، حضرت مدنی نے بادل نخواستہ حکم کو ترجیح دی اور کلکتہ روانہ ہوگئے، شیخ الہند کے حقیقی بھتیجے مولانا راشد صاحب، حضرت مدنی کو کلکتہ روانہ کرنے کا چشم دید حال بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''حضرت شیخ الہند کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، آپ نے حضرت مدنی کا ہاتھ پکڑ کر اپنے تمام جسم پر پھیرا اور دعائیں دے کر خدا حافظ کہا، حضرت مدنی جانے کیلئے مڑے، پانچ دس قدم چلے تو استاد نے شاگرد کو آواز دی سینے سے لگایا، سر پر ہاتھ رکھا اور فرمایا جاؤ، تم کو اللہ کے حوالے کیا، اس وقت ماحول پر عجیب کیفیت طاری تھی اور حاضرین خاص قسم کی برکات وفیوض کا وجود محسوس کررہے تھے''۔

ایک عاشقِ زار کا حال

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو کلکتہ پہنچے ہوئے ابھی کچھ دن ہی گزرے تھے کہ حضرت شیخ الہند وصال فرماگئے، حضرت مدنی کو جب حضرت شیخ الہند کی وفات کی اطلاع دی گئی، تو اس کا نقشہ اور اس کی کیفیت حضرت مدنی خود فرماتے ہیں:

''میں صبح کو تقریباً ۹ر بجے دیوبند پہنچ گیا تھا، اس کے فوراً بعد حضرت شیخ الہند کے در دولت پر پہنچا تو دیکھا کہ لوگ تدفین سے فارغ ہوکر واپس آرہے ہیں، اپنی بدقسمتی اور بے چارگی پر انتہائی افسوس ہوا کہ باوجود سالہا سال حاضر باشی کے شرف کے آخری وقت میں نہ وفات کے وقت حاضر رہا اور نہ دفن میں شرکت کرسکا، کلیجہ پکڑ کر رہ گیا''۔

آپ اندازہ لگاسکتے ہیں کہ جس نے اپنی اولاد، اپنا خاندان، اپنا آرام، اپنی جوانی جس ذات کے لئے وقف کررکھی تھی، نہ تو اس کے آخری غسل میں شریک ہوسکا، نہ تجہیز وتکفین اور نہ نماز جنازہ میں، اردو کے ایک شاعر کی مندرجہ ذیل رباعی ایسی کیفیت کی عکاسی کرتی ہے:

چمن کے تخت پر جس دم شہ گل تھا تجمل تھا
ہزاروں بلبلوں کی فوج تھی ایک شور تھا غل تھا
جب آئے دن خزاں کے کچھ نہ تھا جز خار گلشن میں
بتاتا باغباں رورو کے یہاں غنچہ یہاں گل تھا

یہ شعر بھی مناسب حال ہے:

وائے ناکامی نہ پوچھو عاشق دل گیر سے
ایک دل رکھتا تھا وہ بھی چھن گیا تقدیر سے

بندگانِ خدا کو فائدہ پہنچانا ہمارا فریضہ ہے

قطب زماں، امام انقلاب، وارث علوم قاسمی ورشیدی، اسیر مالٹا شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبند قدس سرہ جیسی یگانہ روزگار شخصیتیں سالوں نہیں قرنوں بعد پیدا ہوتی ہیں، اس قسم کے لوگ اپنی حیات مستعار کے لمحات کو لہو ولعب میں ضائع نہیں کرتے بلکہ زندگی کے ایک ایک لمحہ کو مرضی ومنشاء الٰہی کے مطابق گزار کر اپنے عظیم تر ہونے کا نقش جریدۂ عالم پر ثبت کرکے اس جہاں رنگ وبو سے رخصت ہوجاتے ہیں۔

امت محمدیہ علی صاحبہا الصلاۃ والتحیۃ چونکہ ''خیر امت'' ہے اور اس شرف وکرامت کا سبب ''اخرجت للناس'' کی قرآنی حقیقت ہے، اس لئے آقاء مکی ومدنی کے سچے جانشین اور وارثان علوم نبوت از مہد تا لحد انسانیت کی اصلاح وفلاح کے لئے سرگرم عمل رہتے ہیں، ان کا مطمحِ نظر خلق خدا کی بہتری ہوتا ہے، اس لئے وہ اپنے خداداد علم وعمل اور فکر وعقل سے بندگان خدا کو فائدہ پہنچانا اور اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بہبودی خلق خدا کے لئے وقف کرنا ہی کار خیر سمجھتے ہیں، خدا کی مخلوق کا غم ہوتا ہے اور وہ اس غم میں ناتواں ہڈیوں کو پگھلا دیتے ہیں، حضرت شیخ الہند کی حیات طیبہ پر ایک نظر ڈالیں، سوز وسازی

رومی اور پیچ وتاب رازی کا ایک حسین امتزاج نظر آ جائے گا۔

حکمرانوں اور سلاطین کی نظروں میں آپ کا مقام

والی افغانستان جناب امیر امان اللہ نے آپ کے متعلق افغانستان کی پارلیمنٹ میں کہا تھا کہ ''محمود حسن ایک نور ہے جس کی روشنی میں ہم بہت کچھ دیکھ سکتے ہیں''۔

حجاز کے گورنر جمال پاشا نے آپ کے متعلق کہا تھا کہ ''اس مختصر جثہ اور مختصر ہڈیوں میں کس قدر دین اور سیاست بھری ہوئی ہے''۔

برطانیہ کے ایک ذمہ دار انگریز سر جیمس مسٹن نے کہا تھا کہ ''اگر محمود حسن کو جلا کر راکھ کر دیا جائے تو اس کی راکھ سے بھی انگریزوں سے دشمنی وعداوت کی بو آئے گی''۔

یہ تو حکمرانوں اور سلاطین کے مقولے ہیں، جن سے حضرت اقدس کی سیاسی بصیرت، جوش عمل اور بغض فی اللہ ظاہر ہوتا ہے اور ادھر امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ نے آپ کے متعلق یہ الفاظ فرمائے کہ ''مولوی محمود حسن تو علم کا کٹھلا ہیں'' اور مولانا محمد علی جوہر نے آپ کے متعلق فرمایا'' کہ مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ ہندوستان کے بہت بڑے مذہبی پیشوا ہیں''۔

علالت اور علاج ومعالجہ

۱۳۳۷ھ میں رہائی کے بعد وطن تشریف لائے، علالت اور بدنی ضعف کے باوجود اپنی تحریک کو دوسری حکمت عملی سے جاری فرمایا، الغرض ربیع الاول کے دوسرے عشرہ میں اتوار کے روز آپ کی حالت تشویشناک ہوگئی، مرض لحظہ بلحظہ بڑھتا جا رہا تھا، ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے ساتھ حکیم اجمل خان رحمہم اللہ بھی شریک علاج تھے، مگر وقت موعود آچکا تھا، وفات کے وقت حضرت مولانا الیاس صاحب کاندھلویؒ آپ کے پاس موجود

تھے، اور سورۂ یٰسین شریف تلاوت کر رہے تھے، چند لمحات قبل آپ نے با آواز بلند سات مرتبہ اللہ! اللہ! کہا اور آٹھویں مرتبہ میں آواز بلند ہو کر روح اعلیٰ علیین میں پہنچ گئی۔

وفات

وہ آفتاب علم وعمل جس کی روشنی چہار دانگ عالم میں پھیلی ہوئی تھی بالآخر ۱۸ربیع الاول ۱۳۳۹ھ مطابق ۳۰ر نومبر ۱۹۲۰ء کو دہلی میں غروب ہوگیا، جنازہ دہلی سے بذریعہ ٹرین دیوبند لایا گیا۔"اناللّٰہ وانا الیہ راجعون"

نمازِ جنازہ اور تدفین

آپ کی نماز جنازہ دیوبند میں آپ کے بھائی حکیم محمد حسن صاحبؒ نے پڑھائی اور حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کی قبر مبارک کے قریب آپ کی تدفین عمل میں آئی اور یہ گنجینۂ علم وفضل اور کمالات دنیا کی نظروں سے ہمیشہ ہمیش کے لئے پوشیدہ ہوگیا اور ہر سمت غم واندوہ کی تاریکی چھا گئی، عقیدت کیش نگاہوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور علمی دنیا میں صف ماتم بچھ گئی۔ ویبقی وجہ ربك ذوالجلال والاکرام

مآخذ ومراجع

دار العلوم دیوبند کی پچاس مثالی شخصیات	حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ
نقش دوام	مولانا انظر شاہ کشمیریؒ
تذکرۃ الخلیل	مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ
تذکرۃ الرشید	مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ
اسیران مالٹا	مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ
تحریک ریشمی رومال	مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ
تحریک آزادی ہند میں مسلم علماء اور عوام کا کردار	مولانا محمد سلمان منصور پوری